ہے۔اس کی دکان پر کوئی جائے تو بدبو کے مارے ناک پھٹنے لگتی ہے۔کھڑا نہیں رہا جاتا۔ آب چک میں بھی ایسی بدبو نہ ہوتی ہوگی۔

بجرنگی: مجھے تو گھنٹہ بھر کے لیے راج مل جاتا،تو سب سے پہلے شہر بھر کی تاڑی کی دکانوں میں آگ لگوا دیتا۔

نا یک رام: اب بتاؤ بھیرو! اس کا جواب دو۔ بدبو تو سچ مچ اڑتی ہے۔ ہے کوئی جواب؟

بھیرو: جواب ایک نہیں،سینکڑوں ہیں،پان سڑ جاتا ہے تو کوئی مٹی کے مول بھی نہیں پوچھتا یہاں تاڑی جتنی سڑتی ہے، اتنا ہی اس کا مول بڑھتا ہے۔سرکہ بن جاتی ہے تو روپے بوتل بکتی ہے اور بڑے بڑے جنیو دھاری لوگ کھاتے ہیں۔

نا یک رام: کیا بات کہی ہے کہ جی خوش ہوگیا۔میرا اختیار ہوتا تو اسی دم تم کو وکالت کی سند دے دیتا۔ٹھاکر دین! اب ہار مان جاؤ۔بھیرو سے پیش نہ پاسکو گے۔

جگدھر: بھیرو! چپ کیوں نہیں ہو جاتے؟ پنڈا جی کو تو جانتے ہو۔دوسروں کو لڑا کر تماشا دیکھنا ان کا کام ہے۔اتنا کہہ دینے میں کون سی مرجاد گھٹی جاتی ہے کہ بابا تم جیتے اور میں ہارا۔

بھیرو! کیوں اتنا کہہ دوں؟ بات کہنے میں کسی سے کم ہوں کیا؟

جگدھر: تو ٹھاکر دین! تمہیں چپ ہو جاؤ۔

ٹھاکر دین: ہاں جی! چپ نہ ہو جاؤں گا تو کیا کروں گا؟ یہاں آئے تھے کہ کچھ بھجن کیرتنا ہوگا۔ بے فائدہ کا جھگڑا کرنے لگے۔ پنڈا جی کو کیا۔انہیں تو بے ہاتھ پیر ہلائے امرتیاں اور لڈو کھانے کو ملتے ہیں۔ان کو اسی طرح کی دل لگی سوجھتی ہے۔ یہاں تو پہر رات سے اٹھ کر پھر چکی میں جتنا ہے۔

جگدھر: میری تو اب کے بھگوان سے بھینٹ ہوگی تو کہوں گا کہ کسی پنڈے کے گھر جنم دینا۔

نا یک رام: بھیا! مجھ پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ دبلا پتلا آدمی ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جل پان کے لیے تمہارے ہی کھونچے سے مٹھائیاں لیا کروں۔ مگر اس پر اتنی مکھیاں اڑتی ہیں اور اوپر اتنا میل جمارہتا ہے کہ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔

جگدھر: (چڑ کر) تمہارے نہ لینے سے میری مٹھائیاں سڑ تو نہیں جاتیں کہ بھوکوں مرتا ہوں۔ دن بھر میں روپے بیس آنہ بنا ہی لیتا ہوں۔ جس کو مفت میں رس گلے مل جائیں، وہ میری مٹھائیاں کیوں لے گا؟

ٹھاکر دین: پنڈا جی کی آمدنی کا کوئی ٹھکانا ہے؟ جتنا روز مل جائے تھوڑا ہی ہے اور اوپر سے بھوجن کھاتے ہیں۔ کوئی آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا پھنس گیا تو ہاتھی، گھوڑے، جگہ زمین سب دے گیا۔ ایسا بھاگوان اور کون ہوگا؟

دیا گر: کہیں نہیں ٹھاکر دین! اپنی محنت کی کمائی سب سے اچھی، پنڈوں کو جاتریوں کے پیچھے دوڑتے نہیں دیکھا ہے۔

نا یک رام: بابا! اگر کوئی کمائی پسینہ کی ہے تو وہ ہماری ہے۔ ہماری کمائی کا حال بجرنگی سے پوچھو۔

بجرنگی: اوروں کی کمائی پسینہ کی ہوتی ہے تو تمہاری کمائی تو خون کی ہے اور لوگ پسینہ بہاتے ہیں تم خون بہاتے ہو! ایک ایک ججمان کے پیچھے لہو کی ندی بہہ جاتی ہے۔ جو لوگ کھونچہ سامنے رکھ کر دن بھر مکھی مارا کرتے ہیں وہ کیا جانیں تمہاری کمائی کیسی ہوتی ہے؟ ایک دن مورچہ تھامنا پڑے تو بھاگنے کو جگہ نہ ملے۔

جگدھر: چلو بھی! آئے ہو منہ دیکھی کہنے۔ سیر بھر دودھ کا ڈھائی سیر بناتے ہو۔ اس پر بھگوان کے بھگت بنتے ہو۔

بجرنگی: (غصہ سے) اگر کوئی مائی کا لال میرے دودھ میں ایک بوند پانی نکال دے تو اس کی ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ یہاں دودھ میں پانی ملانا گئو ہتیا سمجھتے ہیں۔ تمہاری طرح نہیں کہ تیل کی مٹھائی کو گھی کی کہہ کر بیچیں اور بھولے بھالے بچوں کو ٹھگیں۔

جگدھر: اچھا بھائی! تم جیتے اور میں ہارا۔ تم سچے تمہارا دودھ سچا۔ بس ہم خراب۔ ہماری مٹھائیاں خراب۔ چلو چھٹی ہوئی۔

بجرنگی: میرے مزاج کو تم نہیں جانتے۔ چپتیاں دیتا ہوں۔ سچ کہہ کر کوئی سو جوتے مارے لیکن جھوٹی بات سن کر میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

بھیرو: بجرنگی! بہت بڑھ کر باتیں نہ کرو۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بس منہ نہ کھلواؤ۔ میں نے تمہیں تمہارے یہاں کا دودھ پیا ہے۔ اس سے تو میری تاڑی ہی اچھی۔

ٹھاکر دین: بھائی! منہ سے جو چاہے ایماندار بن لے پر اب دودھ سپنا ہو گیا۔ سارا دودھ جل جاتا ہے۔ ملائی کا نام نہیں۔ دودھ جب ملتا تھا تب ملتا تھا، ایک آنچ میں انگل بھر موٹی ملائی پڑ جاتی تھی۔

دیا گر: بچہ! ابھی بھلا برا کچھ مل تو جاتا ہے۔ وہ دن آ رہے ہیں کہ دودھ آنکھوں میں لگانے کو بھی نہ ملے گا۔

بھیرو: حال تو یہ ہے کہ گھر والی سیر کا تین سیر بناتی ہے، اس پر دعویٰ یہ کہ ہم سچا مال بیچتے ہیں۔ سچا مال بیچو تو دیوالہ نکل جائے، یہ ٹھاٹ ایک دن نہ چلے۔

بجرنگی: پسینہ کی کمائی کھانے والوں کا دیوالہ نہیں نکلتا۔ دیوالہ ان کا نکلتا ہے جو دوسروں کی کمائی کھا کھا کر موٹے پڑتے ہیں۔ بھاگ کو سراہو کہ شہر میں ہو۔ کسی گاؤں میں ہوتے تو منہ میں مکھیاں آتیں جاتیں۔ میں تو ان سبھوں کو پاپی سمجھتا ہوں جو اونے پونے کر کے ادھر کا سودا ادھر بیچ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ سچی کمائی انہیں کی ہے جو چھاتی پھاڑ کر دھرتی سے دھن نکالتے ہیں۔

بجرنگی نے بات تو کہہ ڈالی لیکن شرمندہ ہو گیا۔ اس لپیٹ میں وہاں کے سبھی آدمی آ جاتے تھے۔ وہ بھیرو، جگدھر اور ٹھاکر دین کو نشانہ بنانا چاہتا تھا، لیکن سور داس، نایک رام، دیا گر سبھی پاپیوں کے درجہ میں آ گئے۔

نا یک رام: تب تو بھیا! تم ہمیں بھی لے بیٹھے۔ ایک پاپی تو میں ہی ہوں کہ سارا دن مٹر گشت کرتا ہوں اور وہ بھوجن کرتا ہوں کہ بڑوں بڑوں کو میسر نہ ہو۔

ٹھاکر دین: دوسرا پاپی میں ہوں کہ شوق کی چیز بیچ کر روٹیاں کماتا ہوں۔ سنسار میں تمبولی نہ رہیں تو کس کا نقصان ہوگا؟

جگدھر: تیسرا پاپی میں ہوں کہ دن بھر اون پون کرتا رہتا ہوں۔ سیوا ورخرمے کھانے کو نہ ملیں تو کوئی مر نہ جائے گا۔

بھیرو: سب سے بڑا پاپی میں ہوں کہ سب کو نشہ پلا کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ سچ پوچھو تو اس سے برا کوئی کام نہیں۔ آٹھوں پہر نشہ بازوں کا ساتھ، انہیں کی باتیں سننا، انہیں کے بیچ میں رہنا، یہ بھی کوئی زندگی ہے۔

دیا گر: کیوں بجرنگی؟ سادھو مہاتما تو سب سے بڑے پاپی ہوں گے کہ وہ کچھ نہیں کرتے۔

بجرنگی: نہیں بابا بھگوان کے بھجن سے بڑھ کر کون کام ہوگا؟ رام نام کی کھیتی سب کاموں سے بڑھ کر ہے۔

نا یک رام: تو یہاں اکیلے بجرنگی پنیا تما ہے اور سب کے سب پاپی ہیں۔

بجرنگی: سچ پوچھو تو سب سے بڑا پاپی میں ہوں کہ گایوں کا پیٹ کاٹ کر ان کے بچھڑوں کو بھوکوں مار کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔

سورداس: بھائی! کھیتی سب سے اتم ہے۔ بان (تجارت) اس سے مدھم ہے۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ بان کو پاپ کیوں کہتے ہو؟ اور کیوں پاپی بنتے ہو؟ ہاں چاکری بری ہے۔ چاہو تو اس کو پاپ کہو۔ اب تک تمہارے اوپر بھگوان کی دیا ہے۔ اپنا اپنا کام کرتے ہو مگر ایسے برے دن آ رہے ہیں جب تمہیں سیوا اور ٹہل کر کے پیٹ پالنا پڑے گا۔ جب تم اپنے نوکر نہیں، پرائے کے نوکر ہو جاؤ گے۔ جب تم میں نیہ دھرم کا نشان بھی نہ رہے گا۔

سورداس نے باتیں نہایت متانت کے ساتھ کہیں جیسے کوئی رشی پیشین گوئی کر رہا ہو۔

سب لوگ سناتے میں آ گئے۔ ٹھاکر دین نے متفکر ہو کر پوچھا ''کیوں سورداس! کوئی مصیبت آنے والی ہے کیا؟ مجھے تو تمہاری باتیں سن کر ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی نئی مصیبت تو نہیں آ رہی ہے؟''

سورداس: ہاں لچھن تو دکھائی دیتے ہیں۔ چمڑے کے گودام والا صاحب یہاں ایک تمباکو کا کارخانہ کھولنے جا رہا ہے۔ میری زمین مانگ رہا ہے۔ کارخانہ کا کھلنا ہی ہمارا اوپر مصیبت کا آنا ہے۔

ٹھاکر دین: تو جب یہ جانتے ہی ہو تو کیوں اپنی زمین دیتے ہو؟

سورداس: میرے دینے پر تھوڑا ہی ہے۔ بھائی! میں دوں تو بھی زمین نکل جائے گی، نہ دوں تو بھی نکل جائے گی۔ روپے والے سب کچھ کر سکتے ہیں۔

بجرنگی: صاحب روپے والے ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ ہماری زمین کیا کھا کر لے لیں گے؟ ماتھے گر جائیں گے ماتھے ٹھٹھا نہیں ہے۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سید طاہر علی آ کر کھڑے ہو گئے اور نائیک رام سے بولے ''پنڈا جی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا ادھر چلے آیئے''

بجرنگی: اسی زمین کے بارے میں کچھ بات چیت کرنی ہے نا؟ وہ زمین نہ بکے گی۔

طاہر علی: میں تم سے تھوڑا ہی پوچھتا ہوں۔ تم اس زمین کے مالک مختار نہیں ہو۔

بجرنگی: کہہ تو دیا وہ زمین نہ بکے گی۔ مختار کوئی ہو۔

طاہر علی: آیئے پنڈا جی آپ! انہیں بکنے دیجیے

نائیک رام: آپ کو جو کچھ ہو کہیے۔ یہ سب لوگ اپنے ہی ہیں کسی سے پردا نہیں ہے۔ سنیں گے تو سب سنیں گے اور جو بات طے ہو گی سب کی صلاح سے ہو گی۔ کہیے کیا کہتے ہیں؟

طاہر علی: اسی زمین کے بارہ میں بات چیت کرنی تھی۔

نائیک رام: تو اس زمین کا مالک آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ جو کچھ کہنا ہے اسی

سے کیوں نہیں کہتے۔ مجھے بیچ میں دلالی نہیں کھانی ہے۔ جب سورداس نے صاحب کے سامنے انکار کر دیا تو پھر کون سی بات باقی رہ گئی؟

بجرنگی: انہوں نے سوچا ہوگا کہ پنڈا جی کو بیچ میں ڈال کر کام نکال لیں گے۔ صاحب سے کہہ دینا یہاں صاجی نہ چلے گی۔

طاہر علی: تم اہیر ہو نا جبھی اتنے گرم ہو رہے ہو۔ ابھی صاحب کو جانتے نہیں ہو۔ جبھی بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے ہو۔ جس وقت صاحب زمین لینے آ جائیں گے، لے ہی لیں گے، تمہارے روکنے نہ رکیں گے۔ جانتے ہو شہر کے حاکموں سے ان کا کتنا میل جول ہے۔ ان کی لڑکی کی منگنی حاکم ضلع سے ہونے والی ہے۔ ان کی بات کو کون ٹال سکتا ہے؟ سیدھے سے رضامندی کے ساتھ دو گے تو اچھے دام پاؤ گے۔ شرارت کرو گے تو زمین بھی نکل جائے گی اور کوڑی بھی ہاتھ نہ لگے گی۔ ریلوں کے مالک کیا زمین اپنے ساتھ لائے تھے؟ ہماری ہی زمین تو لی ہے۔ کیا اسی قاعدے سے یہ زمین نہیں نکل سکتی؟

بجرنگی: تمہیں بھی کچھ طے کرائی ملنے والی ہوگی۔ تبھی اتنی خیر خواہی کر رہے ہو!

جگدھر: ان سے جو کچھ ملنے والا ہو وہ ہمیں سے لے لیجیے اور ان سے کہہ دیجیے کہ زمین نہ ملے گی۔ آپ لوگ جھانسہ باز ہیں۔ ایسا جھانسہ دیجیے کہ صاحب کی عقل گم ہو جائے۔

طاہر علی: میری خیر خواہی روپے کے لالچ سے نہیں ہے۔ اپنے مالک کی آنکھ بچا کر ایک کوڑی بھی لینا حرام سمجھتا ہوں۔ خیر خواہی اس لیے کرتا ہوں کہ ان کا نمک کھاتا ہوں۔

جگدھر: اچھا صاحب بھول ہوئی معاف کیجیے۔ میں نے سنسار کے چلن کی بات کی تھی۔

طاہر علی: تو سورداس! میں صاحب سے جا کر کیا کہہ دوں؟

سورداس: بس یہی کہہ دیجیے کہ زمین نہ بکے گی۔

طاہر علی: میں پھر کہتا ہوں۔ دھوکا کھاؤ گے۔ صاحب زمین کو لے کر چھوڑیں گے۔

سورداس: میرے جیتے جی تو زمین نہ ملے گی۔ ہاں مر جاؤں تو بھلے ہی مل جائے۔

طاہر علی چلے گئے تو بھیرو بولا ''دنیا اپنا ہی فائدہ دیکھتی ہے۔ اپنا کلیان ہو دوسرے جئیں یا مریں۔''

بجرنگی! تمہاری تو گائیں چرتی ہیں۔ اس لیے تمہاری تو بھلائی اس میں ہے کہ زمین بنی رہے۔ میری کون گائے چرتی ہے؟ کارخانہ کھلا تو میری بکری چوگنی ہو جائے گی۔ یہ بات تمہارے دھیان میں کیوں نہیں آئی؟ تم سب کی طرف سے وکالت کرنے والے کون ہو؟ سور داس کی زمین ہے۔ وہ بیچے یا رکھے۔ تم کون ہوتے ہو بیچ میں کودنے والے؟

نا ریک رام: ہاں بجرنگی، جب تم سے کوائی واسطہ سروکار نہیں ہے تو تم کون ہوتے ہو بیچ میں کودنے والے؟ بولو! بھیرو کا جواب دو۔

بجرنگی: واسطہ سروکار کیسے نہیں؟ دس گاؤں اور محلے کے جانور یہاں چرنے آتے ہیں، وہ کہاں جائیں گے۔ صاحب کے گھر کہ بھیرو کے؟ انہیں تو اتنی دکان کی ہائے ہائے پڑی ہوئی ہے۔ کسی کے گھر سیند کیوں نہیں مارتے۔ جلدی سے دھنوان ہو جاؤ گے۔

بھیرو: سیند ماروتم، یہاں دودھ میں پانی نہیں ملاتے۔

دیا گر: بھیرو! تم سچ مچ بڑے جھگڑالو ہو۔ جب تم کو ملائم بات کہنا نہیں آتا تو چپ کیوں نہیں رہتے؟ بہت باتیں کرنا عقل مندی کی نشانی نہیں بلکہ بے عقلی کی نشانی ہے۔

بھیرو: ٹھاکر جی کے بھوگ کے بہانہ سے روز چھاچھ پا جاتے ہو نا، بجرنگی کی جے نہ مناؤ گے۔

نا یک رام: پٹھا بات بے لاگ کہتا ہے کہ ایک بار سن کر پھر کسی کی زبان نہیں کھلتی۔

ٹھاکر دین: اب بھجن بھاؤ ہو چکا۔ ڈھول مجیرا اٹھا کر رکھ دو۔

دیا گر: تم کل سے یہاں نہ آیا کرو۔ بھیرو!

بھیرو: کیوں نہ آیا کریں؟ مندر تمہارا بنوایا ہوا نہیں ہے۔ مندر بھگوان کا ہے۔ تم کسی کو بھگوان کے دربار میں آنے سے روک دو گے؟

نا یک رام: لو بابا جی! اور لو گے؟ ابھی پیٹ بھرا کہ نہیں؟

جگدھر: بابا جی! تمہیں غم کھا جاؤ۔ اس سے سادھر سنتوں کی مہما نہیں گھٹتی۔ بھیرو! سادھوسنتوں کی بات کا تمہیں برا نہ ماننا چاہیے۔

بھیرو: تم خوشامد کرو کیونکہ خوشامد کی روٹیاں کھاتے ہو۔ یہاں کسی کے دبیل نہیں ہیں۔

بجرنگی: لے اب چپ ہی رہنا۔ بھیرو! بہت ہو چکا۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔

نا یک رام: تو بھیرو کو دھمکاتے کیا ہو؟ کیا کوئی بھگوڑا سمجھ لیا ہے تم نے، جب دنگل مارے تھے تب مارے تھے، اب تم وہ نہیں ہو۔ آج کل تو بھیرو کی دوہائی ہے۔

بھیرو نا یک رام کے طنزیہ مذاق پر جھلایا نہیں، ہنس پڑا۔ طنز میں زہر نہیں، رس تھا، سنکھیا مرکر رس ہو جاتا ہے۔

بھیروں کا ہنسنا تھا کہ لوگوں نے اپنے اپنے ساز سنبھالے اور بھجن ہونے لگا۔ سورداس کی سریلی تان خلا میں یوں ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جیسے پانی کے اندر روشنی کی شعاعیں ناچتی ہیں۔

بھجن

جھینی جھینی بینی چدریا

کاہے کا تانا کاہے کی بھرنی کون تارے بنی چدریا

انگلا بنگلا تانا بھرنی سکھمن تارے بنی چدریا

آٹھ کنول دل چرکھا ڈولے پانچ تتو گن تینی چدریا

سائیں کو سیت ماس وس لاگے ٹھوک ٹھوک کے بنی چدریا

سوچا در سر نر من اوڑھیں اوڑھ کے میلی کینی چدریا

داس، کبیر، جتن سے اوڑھی جیوں کی تیوں دھر دینی چدریا

باتوں میں رات زیادہ گزر چکی تھی۔ گیارہ کا گھنٹہ سنائی دیا۔ لوگوں نے ڈھول مجیرے سمیٹ دیئے۔ مجلس برخاست ہوئی۔ سورداس نے مٹھو کو پھر گود میں اٹھایا اور اپنی جھونپڑی میں لاکر ٹاٹ پر سلا دیا۔ آپ زمین پر لیٹ رہا۔

3

مسٹر جان سیوک کا بنگلہ سگرا میں تھا۔ ان کے والد مسٹر ایشور سیوک نے فوجی محکمہ سے پنشن پانے کے بعد وہیں مکان بنوالیا تھا اور اب تک اس کے مالک تھے۔ اس کے آگے ان کے آباؤ اجداد کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی اس کے جاننے کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ ہاں یہ امر البتہ یقینی ہے کہ حضرت عیسیٰ پر اعتقاد لانے کا شرف ایشور سیوک کو نہیں بلکہ ان کے والد کو ملا تھا۔ ایشور سیوک کو اب بھی اپنا عہد طفولیت کچھ کچھ یاد آجاتا تھا۔ جب وہ اپنی والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جایا کرتے تھے۔ ماں کی لاش جلانے کی یاد بھی ابھی نہیں بھولی تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کو یاد آتا تھا کہ میرے گھر میں کئی فوج سپاہی گھس آئے تھے اور میرے والد کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس کے بعد یادداشت کا سلسلہ شکست ہو جاتا تھا۔ ہاں ان کے گورے رنگ و شباہت سے اس بات کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ عالی نسب تھے اور شاید اسی صوبہ میں ان کی قدیم جائے رہائش بھی تھی۔

یہ بنگلہ جس زمانہ میں بنا تھا، اس وقت سگرا میں زمین کی اتنی قدر نہ تھی۔ وسیع احاطہ میں پھول پتوں کی جگہ سبزی ترکاری اور پھلوں کے درخت تھے۔ یہاں تک کہ گملوں میں بھی نفع کو نفاست پر ترجیح دی گئی تھی۔ بیلیں، بردل، کندرو، سیم وغیرہ کی تھیں۔ ایک کنارے کھپریل کا برآمدہ تھا، جس میں گائیں بھینسیں پلی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف اصطبل تھا۔ موٹر کا شوق نہ باپ کو تھا، نہ بیٹے کو۔ فٹن رکھنے میں کفایت بھی تھی اور آسائش بھی۔ ایشور سیوک کو تو موٹروں سے چڑ تھی۔ ان کے شور سے ان کی شانتی میں خلل واقع ہوتا تھا۔ فٹن کا گھوڑا احاطہ میں ایک لمبی رسی باندھ کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اصطبل سے باغ کے لیے کھاد نکل آتی تھی اور صرف ایک سائیس سے کام چل جاتا تھا۔ ایشور سیوک کو خانہ داری کے انتظامات میں خاص ملکہ تھا اور ایسے کاموں میں ان کا حوصلہ ذرا بھی پست نہ ہوتا تھا۔ ان کی آرام کرسی بنگلے کے سائبان میں پڑی رہتی تھی۔ اس پر صبح سے شام تک بیٹھے جان سیوک کی فضول خرچی اور گھر کی بربادی کا رونا رویا کرتے تھے۔ وہ اب بھی باقاعدگی کے ساتھ اپنے لڑکے کو گھنٹہ دو گھنٹہ نصیحت کیا کرتے تھے اور شاید اسی نصیحت کا پھل تھا کہ جان سیوک کی دولت اور عزت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کفایت ان کی زندگی کا اصل اصول تھا اور اس کی خلاف ورزی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اپنے گھر میں فضول خرچی مطلق نہ دیکھ سکتے تھے۔ خواہ روپیہ کسی مہمان ہی کا کیوں نہ ہو۔ مذہب کے ایسے پکے تھے کہ بلاناغہ دونوں وقت گرجا جاتے۔ ان کی اپنی الگ سواری تھی۔ اس تامجان کو ایک آدمی کھینچ کر گرجا کے دروازہ تک پہنچا آیا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ایشور سیوک اس کو فوراً ہی گھر واپس کر دیتے تھے۔ گرجا کے احاطہ میں تامجان کی حفاظت کے لیے کسی آدمی کو بیٹھے رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ گھر آ کر وہ اور کوئی کام کر سکتا تھا۔ اکثر وہ واپس کرتے وقت اس کو کام بھی بتلا دیا کرتے تھے۔ دو گھنٹہ بعد وہ آدمی جا کر ان کو واپس کھینچ لاتا تھا۔ لوٹتے ہوئے وہ حتیٰ الامکان خالی ہاتھ نہ لوٹتے تھے۔ کبھی دو چار پتے مل جاتے۔ کبھی نارنگیاں، کبھی سیر آدھ سیر مکوئے۔ پادری ان کا احترام کرتا تھا۔ اس کی ساری امت میں اتنا مسن اور دوسرا

شخص نہ تھا۔ اس پر دھرم کا اتنا شیدائی۔ وہ اس کے مواعظ کو جتنی محویت اور توجہ سے سنتے تھے اور جتنی عقیدت سے وہاں کے بھجنوں میں شریک ہوتے تھے وہ معیار کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ یہ لوگ ناشتا کی میز پر سے اٹھے۔ مسٹر جان سیوک نے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ ایشور سیوک نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے چائے کا ایک پیالہ پیا تھا اور جھنجھلا رہے تھے کہ اس میں شکر کیوں اتنی جھونک دی گئی ہے۔ شکر کوئی نعمت تو نہیں کہ اپھر کر کھائی جائے ایک تو مشکل سے ہضم ہوتی ہے۔ دوسرے اتنی مہنگی، اس کی نصف شکر چائے کو مزے دار بنائے کے لیے کافی تھی۔ انفاز سے کام کرنا چاہیے۔ شکر کوئی پیٹ بھرنے کی چیز نہیں ہے۔ سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں میری سنتا کون ہے؟ مجھے تو سب نے کتا سمجھ رکھا ہے۔ اس کے بھونکنے کی پرواہ کس کو ہے؟

مسز سیوک نے مذہبیت اور کنایت کا سبق خوب یاد کر رکھا تھا۔ ندامت کا اظہار کرتی ہوئی بولیں۔ ''پاپا! معاف کیجیے آج صوفی نے شکر زیادہ ڈال دی تھی۔ کل سے آپ کو یہ شکایت نہ رہے گی۔ مگر کروں کیا؟ یہاں تو ہلکی چائے کسی کو اچھی نہیں لگتی'' ایشور سیوک نے بے اعتنائی سے کہا'' مجھے کیا کرنا ہے۔ کچھ قیامت تک تو بیٹھا رہوں گا نہیں، مگر گھر کی بربادی کی یہی علامتیں ہیں۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا!''

مسز سیوک: پاپا! میں اپنی بھول مانتی ہوں۔ مجھے اندازہ سے شکر نکال کر دینی چاہیئے تھی۔

ایشور سیوک: ارے تو آج یہ کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ روز تو یہی رونا رہتا ہے، جان سمجھتا ہے میں گھر کا مالک ہوں۔ روپے کماتا ہوں، خرچ کیوں نہ کروں؟ مگر روپیہ کمانا ایک بات ہے اور اس کا مناسب صرف دوسری بات۔ ہوشیار آدمی اس کو کہتے ہیں جو دولت مناسب صرف کرے۔ ادھر لا کر ادھر خرچ کر دیا تو کیا فائدہ؟ اس سے تو نہ لانا ہی اچھا۔ میں سمجھتا ہی رہا مگر اتنی کلاں راس کا گھوڑا لے لیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ تمہیں گھڑ

دوڑ نہیں کرنا ہے۔ ایک ٹٹو سے کام چل سکتا تھا۔ یہی نا کہ اوروں کے گھوڑے آگے نکل جاتے تو اس میں تمہاری کیا شیخی ماری جاتی تھی۔ کہیں دور جانا نہیں پڑتا۔ ٹٹو ہوتا تو چھ سیر کی جگہ دو سیر دانہ کھاتا۔ آخر چار سیر دانہ فضول ہی جاتا ہے نا؟ مگر میری کون سنتا ہے۔ یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا! صوفی! یہاں آ بیٹی! کلام پاک سنا!

صوفیہ پر بھوسیوک کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی مسیح کے اس ارشاد پر اپنا شبہ ظاہر کر رہی تھی کہ غریبوں کے لیے آسمان کی بادشاہت ہے اور امیروں کا بہشت میں جانا اسی قدر غیر ممکن ہے جتنا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں جانا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا غریب ہونا بجائے خود کوئی ثواب ہے اور امیر ہونا بجائے خود کوئی گناہ؟ اس کی عقل سلیم اس کلام کی سچائی کو قبول نہ کرتی تھی۔ کیا مسیح نے صرف اپنے بھگتوں کو خوش کرنے ہی کے لیے دولت کی اس قدر ہجو کی ہے؟ تاریخ بتلا رہی ہے کہ اوائل میں صرف غریب، رنجیدہ، مفلس اور جماعت سے خارج شدہ آدمیوں نے ہی مسیح کے دامن میں پناہ لی تھی۔ اس لیے تو انہوں نے دولت کی اتنی بے وقعتی نہیں کی تھی؟ کتنے ہی غریب ایسے ہیں جو سراپا بے قاعدگی اور بد اخلاقی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شاید ان کی بدکاری ہی ان کی مفلسی کا سبب ہے۔ کیا صرف مفلسی ان کے تمام گناہوں کا کفارہ کر دے گی؟ کتنے ہی دولت مند لوگ ہیں جن کے دل آئینہ کی طرف صاف ہیں، کیا محض ان کی ثروت ان کی تمام نیکیوں کو زائل کر دے گی؟

صوفیہ سچ جھوٹ کی جانچ میں ہمیشہ مصروف رہتی تھی۔ مذہبی اصولوں کو عقل کی کسوٹی پر کسنا اس کی فطرت میں داخل تھا اور جب تک عقل، دلایل کے ذریعہ قبول نہ کرے، اس وقت تک وہ صرف مذہبی کتب کی بنا پر کسی اصول کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ جب اس کے دل میں کوئی شک پیدا ہوتا تو اپنے بھائی پر بھوسیوک کی مدد سے اس کی دفعیہ کی کوشش کرتی۔

صوفیہ: میں اس بارے میں بہت دیر سے غور کر رہی ہوں، پر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

حضرت مسیح نے مفلسی کو اس قدر اہمیت کیوں دی؟ اور دولت وثروت کو کیوں قابل نفریں قرار دیا؟

پربھوسیوک: جا کر مسیح سے پوچھو

صوفیہ: تم کیا سمجھتے ہو؟

پربھوسیوک: میں کچھ نہیں سمجھتا اور نہ کچھ سمجھنا نہ چاہتا ہوں۔ کھانا، سونا اور کھیلنا یہی انسانی زندگی کے تین اصول ہیں۔ ان کے سوا سب گورکھ دھندا ہے۔ میں مذہب کو عقل سے بالکل الگ سمجھتا ہوں۔ مذہب کے تولنے کے لیے عقل اتنی ہی بیکار ہے جتنا کہ بینگن تولنے کے لیے سنار کا کانٹا۔ مذہب مذہب ہے اور عقل عقل، یا تو مذہب کی روشنی اتنی تیز ہے کہ عقل کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں یا پھر اس میں ایسی تاریکی ہے کہ عقل کو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ان جھگڑوں میں بے فائدہ سر کھپاتی ہو۔ سنا! آج پاپا چلتے چلتے کیا کہہ گئے؟

صوفیہ: نہیں میرا دھیان ادھر نہ تھا۔

پربھوسیوک: یہی کہ مشینوں کے لیے جلد آرڈر دے دو۔ اس زمین کو لینے کا انہوں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کا موقع بہت پسند آیا۔ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد بنیاد پڑ جائے، لیکن میرا جی اس کام سے گھبراتا ہے۔ میں نے یہ کاروبار سیکھا تو سچ پوچھو تو میرا جی وہاں بھی نہ لگتا تھا۔ اپنا وقت فلسفہ ادب اور اشعار کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔

وہاں کے نامی گرامی عالموں اور مصنفوں سے بات چیت کرنے میں جو مسرت حاصل ہوتی تھی، وہ کارخانہ میں کہاں نصیب تھی۔ سچ پوچھو تو میں اس لیے وہاں گیا بھی تھا۔ اب عجیب کشمکش میں پڑا ہوں۔ اگر اس کام میں ہاتھ نہیں لگاتا تو پاپا کی دل شکنی ہو گی۔ وہ سمجھیں گے کہ میرے ہزاروں روپیوں پر پانی پھر گیا۔ شاید میری صورت سے نفرت کرنے لگیں۔ کام شروع کرتا ہوں تو خوف ہوتا ہے کہ کہیں میری بیدلی سے نفع کے بجائے نقصان نہ ہو۔ مجھے اس کام میں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو رہنے کو ایک جھونپڑی چاہیے اور فلسفہ ادب کا ایک عمدہ کتب خانہ۔ اس کے سوا مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں۔ یہ

لو دادا کو تمہاری یاد آ گئی۔ جاؤ! نہیں تو یہاں آ پہنچیں گے اور فضول کی بکواس میں گھنٹوں وقت خراب کر دیں گے۔

صوفیہ: یہ مصیبت میرے سر بری پڑی ہے۔ جہاں کچھ پڑھنے بیٹھی، ان کا بلاوا پہنچا آج کل پیدائش کا بیان پڑھوا رہے ہیں۔ مجھے ایک ایک لفظ پر شک پیدا ہوتا ہے۔ کچھ بولوں تو بگڑ جائیں گے۔ بالکل بیگار کرنی پڑتی ہے۔

مسز سیوک بیٹی کو بلانے آ رہی تھیں۔ آخری الفاظ ان کے کانوں میں پڑ گئے۔ تلملا گئیں آ کر بولیں "بے شک کلام پاک پڑھنا بے کار ہے۔ مسیح کا نام لینا پاپ ہے۔ تجھے تو اس اندھے بھکاری کی باتوں میں مزہ آتا ہے۔ ہندوؤں کے گپوڑے پڑھنے میں تیرا جی لگتا ہے۔ کلام پاک تو تیرے لیے زہر ہے۔ خدا جانے تیرے دماغ میں یہ خبط کہاں سے سما گیا ہے۔ جب دیکھتی ہوں تجھے اپنے پاک مذہب کی برائی کرتے ہی دیکھتی ہوں۔ تو اپنے دل میں بھلے ہی سمجھ لے کہ کلام پاک بالکل فرضی و مصنوعی ہے لیکن اندھے کی آنکھوں میں اگر آفتاب کا نور نہ پہنچے تو یہ آفتاب کا قصور نہیں بلکہ اندھے کی آنکھوں ہی کا قصور ہے۔ آج تین چوتھائی دنیا جس مہاتما کے نام پر جان دیتی ہے۔ جس مہاتما کی امرت بانی، آج ساری دنیا کو زندگی بخش رہی ہے۔ اس سے اگر تیرا دل منحرف ہو رہا ہے تو یہ تیری نافہمی اور بد بخت ہے۔ خدا تیرے حال پر رحم کرے!"

صوفیہ: مہاتما عیسیٰ کی شان میں میرے منہ سے کوئی نامناسب بات کبھی نہ نکلی۔ میں انہیں دھرم تاگ اور نیک خیالی کا اوتار سمجھتی ہوں لیکن ان پر ایمان لانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقیدت مندوں نے ان کے مواعظ میں جو ناواجب باتیں بھر دی ہیں یا ان کی ذات سے جو معجزے منسوب کر رکھے ہیں، ان پر بھی ایمان لاؤ اور یہ زیاتی کچھ حضرت مسیح کے ساتھ ہی نہیں کی گئی بلکہ دنیا کے سبھی مہاتماؤں کے ساتھ ایسا کیا گیا ہے۔

مسز سیوک: تجھے کلام پاک کے ہر لفظ پر ایمان لانا ہوگا ورنہ تو اپنا شمار حضرت مسیح کی بھیڑوں میں نہیں کر سکتی۔

صوفیہ: تو میں اپنے کو بدرجہ مجبوری ان کی امت کے باہر سمجھو گی کیونکہ بائبل کے ہر لفظ پر ایمان لانا میرے لیے ناممکن ہے۔

مسز سیبوک: تو کافر اور مردود ہے۔ حضرت مسیح تجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔

صوفیہ: اگر مذہبی تنگ خیالی سے دور رہنے کے سبب یہ نام دیئے جاتے ہیں تو مجھے ان کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔

مسز سیبوک سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ ابھی تک انہوں نے اپنا قاتل وار نہ کیا تھا۔ مامتا ہاتھوں کو روکے ہوئے تھی لیکن صوفیہ کی گستاخانہ بحث نے بالآخر ان کے تحمل کا خاتمہ کر دیا۔ بولی ''حضرت مسیح سے منحرف ہونے والے کے لیے اس گھر میں جگہ نہیں ہے''

پربھو سیبوک: ماما! آپ سخت ظلم کر رہی ہیں۔ صوفیہ یہ کب کہتی ہے کہ مجھے حضرت مسیح پر اعتقاد نہیں ہے۔

مسز سیبوک: ہاں وہ یہی تو کہہ رہی ہے۔ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔ کلام پاک پر ایمان نہ لانے کے اور کیا معنے ہو سکتے ہیں؟ اس کو حضرت یسوع کے معجزوں پر شبہ اور ان کے اخلاقی مواعظ پر شک ہے۔ یہ ان کے کفارہ کی حقیقت کو نہیں مانتی۔ ان کے پاک احکامات کو تسلیم نہیں کرتی۔

پربھو سیبوک: میں اس نے کو حضرت یسوع کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

صوفیہ: میں مذہبی معاملات میں اپنے ضمیر کے سوا اور کسی کے احکامات کو نہیں مانتی۔

مسز سیبوک: میں تجھ کو اولاد نہیں سمجھتی اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

یہ کہہ کر وہ صوفیہ کے کمرہ میں گھس گئی اور اس کی میز پر سے بودھ مذہب اور ویدانت فلاسفی کی کئی کتابیں اٹھا کر باہر برآمدہ میں پھینک دیں۔ اسی جوش میں انہیں پیروں سے کچلا اور پھر جا کر ایشور سیبوک سے بولیں۔ ''پاپا! آپ صوفی کو ناحق بلا رہے ہیں۔ وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے۔''

مسٹر ایشور سیوک ایسا چونکے گویا بدن پر آگ کی چنگاری گر پڑی ہو اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر بولے: ''کیا کہا صوفی حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے؟ صوفی ؟''

مسز سیوک: ہاں ہاں صوفی! کہتی ہے مجھے ان کے معجزوں، ان کے مواعظ اور احکامات پر اعتقاد نہیں ہے۔

ایشور سیوک: (ٹھنڈی سانس کھینچ کر) یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا! اپنی گمراہ بھیڑوں کو راہ راست پر لا! کہاں ہے صوفی! مجھے اس کے پاس لے چلو! میرے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤ۔ خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور سے منور کر! میں اس کے پیروں پر گروں گا۔ اس سے منتیں کروں گا۔ اس کو عاجزی سے سمجھاؤں گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو!

مسز سیوک: میں سب کچھ کر کے ہار گئی۔ اس پر خدا کا قہر ہے۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

ایشور سیوک: بیٹی! ایسی باتیں نہ کرو وہ میرے گوشت کا گوشت، میرے خون کا خون، میری جان کی جان ہے! میں اسے کلیجہ سے لگاؤں گا۔ یسوع نے کافروں کو سینہ سے لگایا تھا۔ سیاہ کاروں کو اپنے دامن میں پناہ دی تھی۔ وہ میری صوفیہ پر ضرور رحم کرے گا۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا!

جب مسز سیوک نے اب بھی سہارا نہ دیا تو ایشور سیوک لکڑی کے سہارے اٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ کے دروازہ پر آ کر بولے ''بیٹی صوفی! کہاں ہے؟ ادھر آ بیٹی! تجھے گلے سے لگاؤں۔ ہمارا یسوع خدا کا دولارا بیٹا تھا۔ غریبوں کا مددگار، کمزوروں کا محافظ، مفلسوں کا دوست، ڈوبتوں کا سہارا، گناہ گاروں کا شافع، دکھیوں کا بیڑا پار کرنے والا۔ بیٹی! ایسا اور کون سا نبی ہے جس کا دامن اتنا وسیع ہو جس کی گود میں دنیا کے سارے گناہوں، ساری برائیوں کے لیے جگہ ہو؟ وہی ایک ایسا نبی ہے جس نے بدکاروں کو، کافروں کو، گناہ گاروں کو نجات کا مژدہ دیا۔ نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کے لیے نجات کہاں تھی؟ ہم کو بچا لینے والا کون تھا؟''

یہ کہتے کہتے انہوں نے صوفیہ کو گلے سے لگا لیا۔ ماں کے سخت الفاظ نے اس کے ضعیف غصہ کو تیز کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرہ میں آ کر رو رہی تھی۔ طبیعت بار بار پریشان ہو جاتی تھی۔ سوچتی تھی ابھی اسی وقت اس گھر سے نکل جاؤں۔ کیا اس وسیع دنیا میں میرے لیے جگہ نہیں ہے؟ میں کام کر سکتی ہوں۔ اپنا بوجھ آپ سنبھال سکتی ہوں۔ ضمیر کی آزادی کا خون کر کے اگر مجھ کو تفکرات زندگی سے فراغت ملی، تو کیا میرا ضمیر ایسی حقیر شے نہیں ہے کہ پیٹ کے لیے اس کا خون کر دیا جائے۔ پربھو سیوک کو اپنی بہن سے ہمدردی تھی۔ مذہب پر ان کو اس کے کہیں کم اعتقاد تھا، لیکن وہ اپنی آزاد خیالی کو اپنے ہی دل تک محدود رکھتے تھے۔ گرجا چلے جاتے تھے۔ گھر کی روزانہ دعاؤں میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ مذہبی بھجن بھی گا لیتے تھے۔ وہ مذہب کو سنجیدہ خیالی کے دائرہ سے خارج سمجھتے تھے۔ وہ گرجا میں بھی اسی خیال سے جاتے جس خیال سے کہ تھیٹر دیکھنے۔ انہوں نے کمرہ سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں ماما تو نہیں دیکھ رہی ہیں کہ مجھ پر ان کا قہر ابھی نازل ہو جائے۔ پھر چپکے سے صوفیہ کے پاس آئے اور بولے ''صوفی! کیوں نادان بنتی ہو۔ سانپ کے منہ میں انگلی ڈالنا کون سی عقل مندی ہے؟ دل میں جو چاہے خیال کرو۔ جن باتوں کو جی چاہے مانو۔ پر اس طرح ڈھنڈورا پیٹنے سے کیا فائدہ؟ جماعت میں نکو بننے کی کیا ضرورت؟ کون تمہارے دل کے اندر دیکھنے جاتا ہے؟''

صوفیہ نے بھائی کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''میں مذہب کے معاملہ میں قول و فعل کو یکساں رکھنا چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں دونوں سے ایک ہی راگ نکلے میرے لیے'' گندم نمائی جوفروشی ناممکن ہے۔ ضمیر کی آزادی کے لیے میں دنیا بھر کی تکلیفیں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اگر میرے لیے اس گھر میں جگہ نہیں ہے، تو خدا کی خلق کی ہوئی وسیع دنیا تو ہے۔ کہیں بھی اپنا گزارہ کر سکتی ہوں۔ میں ساری تکلیفیں سہہ لوں گی۔ رسوائی کا مجھے ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ مگر اپنی نگاہوں میں گر کر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی مان لوں کہ میرے لیے چاروں طرف دروازے بند ہیں تو بھی میں اپنے ضمیر کا سودا

کرنے کی بہ نسبت بھوکوں مر جانا کہیں بہتر خیال کرتی ہوں

پربھوسیوک: دنیا اس سے کہیں زیادہ تنگ ہے جتنا تم خیال کرتی ہو۔

صوفیہ: قبر کے لیے تو جگہ نکل ہی آئے گی!

یکا یک ایشور سیوک نے جا کر اس کو سینہ سے لگا لیا اور اپنے عقیدت مندانہ آنسوؤں سے اس کی تفتہ دلی کو مٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ صوفیہ کو ان کی خوش اعتقادی پر رحم آ گیا۔ کون ایسا بے رحم ہے جو بھولے بھالے بچے کے اسپ چوبین کا مضحکہ اڑا کر اس کا دل دکھائے۔ اس کے خوب مسرت کو پریشان کر دے؟

صوفیہ نے کہا: دادا! آپ آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں۔ کھڑے کھڑے آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔

ایشور سیوک: جب تک تو اپنی زبان سے نہ کہے گی کہ میں یسوع پر اعتقاد رکھتی ہوں، تب تک میں تیرے دروازہ پر اسی طرح فقیروں جیسا کھڑا رہوں گا۔

صوفیہ: دادا میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں یسوع پر اعتقاد نہیں رکھتی ہوں۔ میں انہیں ایک بہت بڑا قابل تقلید بزرگ اور عفو و رحم کا اوتار سمجھتی ہوں اور سمجھتی رہوں گی۔

ایشور سیوک نے صوفیہ کے رخساروں کو بوسہ دے کر کہا ''بس میرا دل مطمئن ہو گیا یسوع تجھے اپنے دامن میں لے۔ اب میں بیٹھتا ہوں۔ مجھ کو کلام پاک سنا! میرے کانوں کو یسوع کے کلمات سے پاک بنا؟''

صوفیہ انکار نہ کر سکی۔ پیدائش کا ایک باب کھول کر پڑھنے لگی۔ ایشور سیوک آنکھیں بند کر کے کرسی پر بیٹھ گئے اور ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے مسز سیوک نے یہ نظارہ دیکھا اور فاتحانہ انداز سے مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

یہ مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن ایشور سیوک کے مرہم سے صوفیہ کے دل کا ناسور نہ اچھا ہو سکتا تھا۔ آئے دن اس کے دل میں مذہبی شکوک پیدا ہوتے رہتے تھے اور اسے اپنے گھر میں رہنا روز بروز زیادہ نا قابل برداشت ہوتا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پربھوسیوک کی ہمدردی بھی کم

ہونے لگی۔ مسٹر جان سیوک کو اپنے تجارتی مشاغل سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ صوفیہ کی دماغی پریشانیوں کو رفع کرتے۔ مسز سیوک کامل خودمختاری سے اس پر حکومت کرتی تھی۔ صوفیہ کے لیے سخت ترین آزمائش کا موقع وہ ہوتا تھا جب وہ ایشور سیوک کو بائبل پڑھ کر سناتی تھی۔ اس آزمائش سے بچنے کے لیے وہ ہر روز بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی۔ پس اس کو اپنی مصنوعی زندگی سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔ اس کا دل بار بار تقاضا کرتا کہ گھر سے کہیں نکل جائے اور آزادی کے ساتھ حق و باطل کی تحقیق میں مصرف ہو لیکن اس خواہش کو عملی میدان میں قدم رکھتے ہوئے ہچک جانا پڑتا تھا۔ پہلے پربھو سیوک سے اپنے شکوک کا اظہار کر کے وہ مطمئن ہو جایا کرتی تھی مگر جوں جوں ان کی بے رخی بڑھنے لگی، صوفیہ کے دل سے بھی ان کی عزت اور محبت زائل ہونے لگی۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہو گیا کہ پربھو سیوک کا دل صرف آسائش اور آرام طلبی کا غلام ہے جس کا اصولوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہاں تک کہ ان کے اشعار بھی جنہیں وہ پہلے بڑے شوق سے سنا کرتی تھی، اب اس کو محض فرضی باتوں سے مملو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اکثر ٹال دیا کرتی کہ میرے سر میں درد ہے۔ سننے کو جی نہیں چاہتا۔ اپنے دل میں کہتی کہ ان کو ایسے پاک جذبات و خیالات کو قلمبند کرنے کا کیا حق ہے جن کا اظہار دلی ایجاب اور تجربہ پر مبنی نہ ہو۔

ایک روز جب گھر سے سب لوگ گرجا گھر جانے لگے تو صوفیہ نے دردسر کا بہانہ کیا۔ اب تک وہ شکوک کے باوجود بھی گرجا چلی جایا کرتی تھی۔ پربھو سیوک اس کے دل کی بات تاڑ گئے۔ بولے ''صوفی! گرجا جانے میں تمہیں کیا عذر ہے؟ وہاں جا کر آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھے رہنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔''

پربھو سیوک بڑے شوسے گرجے جایا کرتے تھے۔ وہاں انہیں ریا و نمود، ڈھونگ اور ڈھکوسلہ کی فلسفیانہ تحقیقات کرنے اور گنز گوئیوں کے لیے مسالہ جمع کرنے کا موقع خوب ملتا تھا۔ صوفیہ کے لیے عبادت کھیل کی چیز نہ تھی بلکہ تسکین و آسودگی کی بولی ''تمہارے لیے آسان ہے مگر میرے لیے مشکل''

پربھوسیوک: کیوں اپنی جان وبال میں ڈالتی ہو؟ ماما کے مزاج سے تو خوب واقف ہو۔

صوفیہ: میں تم سے رائے نہیں طلب کرتی۔ اپنے کاموں کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار ہوں۔

مسز سیوک نے آ کر پوچھا: صوفی! کیا سر میں اتنا درد ہے کہ گرجا تک نہیں جا سکتیں۔

صوفیہ: جا کیوں نہیں سکتی۔ پر جانا نہیں چاہتی

مسز سیوک: کیوں؟

صوفیہ: میری طبیعت، میں نے گرجا جانے کا عہد نہیں کر رکھا ہے؟

مسز سیوک: کیا تو چاہتی ہے کہ ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں؟

صوفیہ: ہرگز نہیں میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے گرجا جانے کے لیے مجبور نہ کریں

ایشور سیوک پہلے ہی اپنے تامجان پر بیٹھ کر چل دیئے تھے۔ جان سیوک نے آ کر صرف اتنا پوچھا ''صوفی! کیا سر میں زیادہ درد ہے؟ میں ادھر سے کوئی دوا لیتا آؤں گا۔ ذرا پڑھنا کم کر دو اور روز گھومنے جایا کرو''

یہ کہہ کر پربھوسیوک کے ساتھ فٹن پر جا بیٹھے، لیکن مسز سیوک اتنی آسانی سے اس کا گلا چھوڑنے والی نہ تھیں بولیں ''تجھے یسوع کے نام سے کیوں اتنی نفرت ہے؟''

صوفیہ: میں ان پر دل سے اعتقاد رکھتی ہوں

مسز سیوک: تو جھوٹ بولتی ہے

صوفیہ: اگر دل میں اعتقاد نہ ہوتا تو زبان سے ہرگز نہ کہتی۔

مسز سیوک: تو یسوع کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہے۔

صوفیہ: ہرگز نہیں میرا عقیدہ ہے کہ میری نجات اگر ہو سکتی ہے تو میرے اعمال کے ذریعے